ملّی انتشار میں دینی تقاضے

نظمِ اجتماعی کی بحالی کی ضرورت

اُمتِ مسلمہ کے لیے ایک منظم اجتماعی زندگی جس حد تک ضروری ہے، اور جس لیے ضروری ہے، پچھلے مباحث نے ہم پر یہ بات پوری طرح واضح کر دی ہے۔ لیکن اس دنیا میں کوئی گروہ ہمیشہ اپنی مطلوبہ حالت ہی میں باقی و کارفرما نہیں پایا گیا ہے۔ اس لیے یہ ملت بھی ایسے حالات سے دوچار ہو سکتی ہے جب وہ اپنی اس ضروری ہیئتِ اجتماعیہ سے محروم ہو چکی ہو، جب وہ ایک منظم اور منضبط جماعت رہنے کے بجائے افراد کی بس ایک بھیڑ بن گئی ہو، جس میں نہ کوئی شیرازہ بندی ہو نہ کوئی اجتماعی حرکت ہو، اور اس لیے عملاً اس کا وہ مقصد بھی باقی نہ رہ گیا ہو جس کے لیے وہ وجود میں آئی تھی ——— جیسا کہ آج ایک مدت سے اس کا یہی حال فی الواقع ہو بھی چکا ہے ——— ایسی صورت حال کے بارے میں یہ کہنا کہ اسلام کے نزدیک وہ سخت ناپسندیدہ بلکہ ناقابل برداشت ہے، ایک غیر ضروری بات ہوگی۔ کیونکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اسی صورت حال کے بارے میں یہ بات کہ پھر اس شکل میں افرادِ ملت کو کرنا کیا چاہیے، اتنی واضح اور روشن نہیں ہے۔ اس لیے نظری اور عملی، ہر حیثیت سے ضروری ہے کہ اس اہم ترین سوال کا صحیح جواب معلوم کیا جائے۔

پہلے اس سوال کا عقلی جواب متعین کیجیے۔

اوپر کے سارے مباحث ہمارے سامنے ہیں۔ ان مباحث میں ہم دیکھتے ہیں کہ اجتماعیت ——— انتہائی ٹھوس، منظم اور منضبط اجتماعیت ——— اسلام کے لیے فطرتاً مطلوب، اور عملاً ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر نہ امتِ مسلمہ، اُمتِ مسلمہ بن کر رہ سکتی ہے، نہ اسلام نوعِ انسانی کو وہ

سب کچھ دے سکتا ہے جسے دینے کے لیے وہ آیا ہے۔ اس کے بے شمار احکام جن کا تعلق انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل تک سے ہے، صرف کتابت اور تلاوت کے لیے وقف ہو کر رہ جاتے ہیں، اور عملی دنیا میں ان کے نافذ اور قابل اتباع ہونے کی کوئی شکل بن ہی نہیں سکتی۔ یہ سب کچھ ہم واضح اور قطعی دلائل کی روشنی میں دیکھ چکے ہیں۔ اب غور کیجیے کہ عقل ان ساری باتوں کا تقاضا کیا ٹھیراتی ہے؟ یہی، یا اس کے سوا کچھ اور، کہ یہ ملت 'بھیڑ' سے پھر 'جماعت' بنے، ایسی جماعت جس میں نظم و اتحاد ہو، یک رنگی و یک حرکتی ہو، اور جسے ''الجماعۃ'' کہہ سکیں، اور جو اپنے مقصد وجود کو پورا کرنے کے قابل ہو سکے؟ کوئی شک نہیں کہ عقل کا فیصلہ اور تقاضا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد اس سوال کا شرعی جواب معلوم کیجیے، اور یہی جواب فی الواقع اصل جواب ہوگا:

اس غرض سے ہم جب کتاب الٰہی اور سنتِ رسولؐ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمارے سامنے سب سے پہلے قرآن حکیم کی یہ ہدایتیں آتی ہیں:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا .... وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا.

(آل عمران: ۱۰۲-۱۰۳)

''اے ایمان والو! اللہ کی رسی کو تم سب کے سب مضبوط پکڑ لو اور علیحدہ علیحدہ نہ رہو۔''

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً. (بقرہ: ۲۰۸)

''اے ایمان والو! (اللہ اور رسولؐ کی) اطاعت میں تم سب کے سب داخل ہو رہو۔''

پہلی آیت کا منشا زیر بحث مسئلہ کے خصوص میں بالکل واضح ہے۔ وہ براہ راست یہی ہدایت دیتی ہے کہ سارے مسلمانوں کو متحد و منظّم رہنا چاہیے، اور ضروری ہے کہ اللہ کی رسی انھیں باہم مضبوطی سے جوڑے ہوئے ہو۔ رہی دوسری آیت، تو بالواسطہ وہ بھی اسی فریضے کی تلقین کر رہی ہے۔ کیوں کہ ایک ایک فرد مسلم کا اللہ اور رسولؐ کی کلی اور غیر مشروط اطاعت میں اپنے آپ کو دے دینا اس بات کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہنے دے سکتا کہ ملت پھر بھی غیر منظّم حالت میں رہ

جائے۔ سارے کے سارے مسلمان اگر دین حق کو اپنی زندگیاں حوالے کر دیں ـــــ اس دین حق کو، جو معاشرے کے لیے ایک منظم جماعتی زندگی گزارنا ضروری قرار دیتا اور اس کے لیے سمع و طاعت کے تفصیلی احکام دیتا ہے ـــــ تو اس کا حاصل لازماً یہی ہوگا کہ مسلم معاشرہ ''سیسہ پلائی ہوئی دیوار'' بن جائے۔ اس لیے آیت کا منشا بالواسطہ یہ بھی ہے کہ ملت اگر پوری طرح متحد و یک رنگ نہ ہو تو لازماً متحد و یک رنگ ہو جائے۔

یہ ہدایتیں عام اور ہمہ گیر ہدایتیں ہیں۔ یہ کسی خاص حالت، یا کسی خاص وقت، یا کسی خاص مقام و ماحول کے لیے کسی طرح بھی مخصوص نہیں، جب بھی، اور جہاں کہیں بھی، مسلمانوں کا کوئی چھوٹا یا بڑا گروہ موجود ہوگا، وہ ان ہدایات کا مخاطب ہوگا، اور ضروری ہوگا کہ وہ انھیں سنے اور اپنے مقدور بھر اُن پر عمل کرے۔ ان آیتوں کے اندر کوئی معمولی سا بھی قرینہ ایسا نہیں جس سے یہ خیال کیا جا سکتا ہو کہ یہ ہدایتیں صرف صحابہ کرامؓ کے لیے تھیں۔ اس لیے ان احکام خداوندی کے مخاطب و مکلّف ہر دَور کے مسلمان ہوں گے، چاہے وہ پہلی صدی ہجری کے مسلمان ہوں جب کہ اُمت مسلمہ 'حبل اللہ' کے شیرازے میں پوری طرح کسی بندھی تھی، چاہے اس چودھویں صدی ہجری کے مسلمان ہوں جب کہ اس شیرازے کی دھجیاں اڑ چکی ہیں۔ بلکہ سچ پوچھیے تو ان احکام کا خطاب جتنی اہمیت اور شدت کے ساتھ اُس دَورِ نظم و اتحاد کے مسلمانوں سے تھا، اس سے کہیں زیادہ اہمیت اور شدت کے ساتھ اس دَورِ افتراق و انتشار کے مسلمانوں سے ہوگا۔ کیونکہ ان احکام کی عملی حیثیت و اہمیت اُن کے لیے تو فی الواقع ایک تلقین احتیاط سے کچھ ہی زیادہ تھی، جب کہ ان کے لیے حکم اور وصیت سے بھی بہت زیادہ ہو چکی ہے۔ ایک نڈھال مریض کے لیے تندرست آدمیوں کے مقابلے میں حفظانِ صحت کے اصولوں کا لحاظ بہر حال کہیں زیادہ ضروری ہوتا ہے۔

کلام اللہ کے بعد کلامِ رسولؐ کی طرف آیئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ملی اختلاف و انتشار کی حالت کا براہِ راست تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ بَعْدُ فَسَيَرٰى اِخْتِلَافًا كَثِيْرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ

الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ تَمَسَّکُوْا بِھَا وَعَضُّوْا عَلَیْھَا بِالنَّوَاجِزِ.

(ابوداؤد، جلد دوم، کتاب السنۃ)

''جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ امت میں بہت سارے اختلافات برپا ہوتے دیکھیں گے۔ ایسے وقت میں تمھارے لیے ضروری ہوگا کہ ''میری سنت'' اور میرے برسرِ ہدایت اور پیروحق ''خلفا کی سنت'' کو مضبوطی سے تھامے اور دانتوں سے پکڑے رہو۔''

ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ایک جامع اور اصولی ہدایت ہے۔ یہ ایک ایک مسلمان کا شانہ پکڑ کر تلقین کرتی ہے کہ دیکھو، اُمت میں جب بھی، اور جس طرح کا بھی، کوئی اختلاف رونما ہو اس وقت ''رسولِ خدا کی سنت'' اور ''خلفائے راشدین کی سنت'' پر مضبوطی سے جم جانا، ورنہ اس کے سوا کوئی روش نہ ہوگی جو تمھارے لیے صحیح ایمانی روش کہی جاسکے۔

اس حدیث میں ''سنت'' کے لفظ کا مفہوم کیا ہے؟ پہلے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ یہاں اس لفظ کا وہ محدود مفہوم نہیں ہے جو ایک فقہی اصطلاح کی حیثیت سے اس کا ہوا کرتا ہے، اور جو عام طور سے معروف و متعارف ہے۔ اس حقیقت کی سب سے واضح دلیل خود اسی حدیث کے لفظوں میں موجود ہے۔ اس حدیث میں صرف ''عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ'' کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ ''وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ'' کے الفاظ بھی ہیں یعنی اختلافات کے وقت ''سنت رسولؐ'' کے ساتھ ساتھ ''خلفائے راشدین'' کی سنت کو بھی دانتوں سے پکڑے رہنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ فقہی اصطلاح میں جس چیز کو سنت کہتے ہیں اس کا اطلاق صرف انھی باتوں پر ہوسکتا ہے جن کا تعلق رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال سے ہو، نہ کہ ان باتوں پر بھی جن کا تعلق اصلاً خلفائے راشدین یا کسی اور صحابی کے اقوال اور اعمال اور اجتہادات سے ہو۔ اس لیے اس حدیث میں 'سنت' کا وہی وسیع مفہوم ہے جو ازروئے لغت اس لفظ کا ہونا چاہیے، یعنی طریقہ اور روش، جیسا کہ بے شمار حدیثوں میں یہی مفہوم اس لفظ کا لیا گیا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں جب بھی اس لفظ کو استعمال فرمایا ہے، اکثر وبیش تر اسی معنی و

مفہوم میں استعمال فرمایا ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت نبی کے، اور خلفائے راشدین نے بحیثیت خلفائے راشدین کے، زندگی کے جس معاملے میں بھی جو کچھ کیا ہے وہ سب آپ کی اور حضرات خلفائے راشدین کی 'سنت' ہے۔ خواہ اس کا تعلق عبادتی امور، معاشرتی آداب اور تمدنی طور طریقوں سے ہو، خواہ سیاست و اجتماع کے وسیع تر مسائل سے۔

اس وضاحت کی روشنی میں ارشادِ نبویؐ کا مدعا یہی قرار پائے گا کہ میں تمھارے سامنے دین کی پیروی، اس کی اقامت، اور اس کے جملہ تقاضوں کی انجام دہی کے سلسلے میں جو کچھ کر رہا ہوں، اور میرے بعد میری ہی پیروی میں خلفائے راشدین جو کچھ کریں گے، تمھارا فرض ہوگا کہ تم بھی وہی کچھ کرنا، خصوصاً جب اُمت میں اختلافات سر اٹھالیں، اس وقت تو اس امر کی ضرورت اور شدید ہو جائے گی۔

غور فرمائیے، اُمت کا اجتماعیت سے محروم ہو رہنا کون سی حالت ہے؟ کیا یہ حالتِ اختلاف نہیں؟ بلاشبہ یہ حالتِ اختلاف ہی نہیں، بلکہ اس سے بھی آگے کی حالت ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جس کے اظہار و بیان کے لیے اگر کوئی تعبیر موزوں ہو سکتی ہے تو صرف یہی کہ یہ بے شمار اختلافات کی پیدا کی ہوئی آخری بدترین حالت ہے۔ اس لیے اگر کسی ایک اختلاف کے رُونما ہو جانے پر آپؐ کی اور آپؐ کے خلفائے راشدین کی 'سنت' کو دانتوں سے پکڑ لینا ضروری ہے تو بے شمار اختلافات کا بدترین نتیجہ سامنے آچکنے پر اس ہدایت کی پیروی یقیناً ضروری سے ضروری تر ہو جائے گی۔

اب آیئے دیکھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی، اور آپؐ کے خلفائے راشدین کی سنت، اس طرح کے کسی معاملے میں کیا رہی ہے؟ یا کم از کم یہ کہ اصولاً کیا ہو سکتی تھی؟

اس سلسلے میں جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کا تعلق ہے، آپ کی کوئی ایسی سنت، اور طریق کار تو ہم پا ہی نہیں سکتے جس کا ملی پراگندگی کی حالت سے براہ راست تعلق ہو۔ کیونکہ آپؐ کے مبارک دَور میں اس نامبارک حالت کے پائے جانے کا کوئی عملی امکان تھا ہی نہیں۔ اس

لیے آپؐ کے اسوہ اور آپؐ کی 'سنت' میں اس بات کی تلاش بھی بے وجہ اور فضول ہی ہوگی کہ ملی انتشار اور بے نظمی کی کسی حالت میں آپؐ نے کیا کیا تھا؟ آپؐ کا سارا کام صرف ایک نئی امت کی تشکیل تھا۔ اس لیے ملی انتشار کے مواقع کے لیے ہمیں جو رہنمائی مل سکتی ہے وہ آپؐ کے اسی اسوہ اور طریق کار سے ماخوذ رہنمائی ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اس غرض کے لیے بھی ہمیں صرف یہی دیکھنا ہوگا کہ اُمت کی تشکیل آپؐ نے کس طرح کی تھی؟ پھر جو کچھ، اور جیسا کچھ آپ کو ہم اس سلسلے میں کرتا ہوا پائیں گے اسی سے اُمت کی تنظیم جدید کے لیے بھی کسبِ ہدایت کریں گے، اور یہی حالتِ اختلاف میں آپؐ کی 'سنت' کو مضبوطی سے پکڑنا ہوگا۔ یہ بات کہ آپؐ نے اُمت کی تشکیل کس طرح کی تھی، کسی تفصیلی تعارف کی محتاج نہیں۔ ہر واقف حال جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اسی بات کو کافی نہیں قرار دے لیا تھا کہ لوگ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ کا اقرار کرلیں اور پھر اپنے اپنے طور پر نماز روزہ ادا کرتے رہیں، بلکہ آپؐ کی دعوت کے لوازم و مضمرات اس سے بہت آگے تک کے تھے۔ آپؐ نے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا کا جو مفہوم اپنے عمل سے قرار دیا وہ یہ تھا کہ جو شخص بھی اسلام قبول کرتا، اس کی زندگی آپ سے آپ ایک مضبوط تنظیم کا جز بن جاتی اور آپؐ ایسے تمام افراد کو اجتماعیت کے رشتے میں اس طرح پروئے جاتے جس طرح تسبیح کے دانے پروئے جاتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ مدنی دور کے کئی برسوں تک اسلام لانے والوں کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ آجائیں۔ گویا ذہنی اور عملی طور ہی پر ان کا ایک منظّم گروہ بنتے جانا کافی نہ تھا، بلکہ حالات کے تحت اس وقت ظاہری اور جسمانی طور پر بھی ان کا ایک محاذ پر آکر جمع ہوجانا تقاضائے دین وایمان تھا۔ یہ حکم آپؐ نے اس وقت تک واپس نہیں لیا جب تک کہ اسلام سیاسی طور پر پوری طرح مضبوط نہ ہوگیا، اور اس بات کا کوئی واقعی خطرہ باقی نہ رہ گیا کہ کفر و شرک کی طاقتیں اس کے قیام میں مانع ہوسکتی ہیں۔ فتح مکہ کے بعد، جب حالات اس طرح کے ہوگئے، تب جاکر آپؐ نے یہ اعلان فرمایا کہ اب کسی شخص کو اپنے وطن سے منتقل ہوکر مدینہ آنے کی ضرورت نہیں رہی، جو جہاں ہو وہیں رہ کر نظامِ ملی کا جز بنا رہے اور اپنے انفرادی فرائض

کے ساتھ اجتماعی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہوتا رہے۔(لا ھِجرَۃَ بَعْدَ الفَتحِ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریق کار کو سامنے رکھ کر قیاس یہی کیا جا سکتا ہے کہ اگر آپ کو ملی افتراق وانتشار کی کسی حالت سے سابقہ پیش آیا ہوتا تو آپؐ کی سنت اس وقت بھی یہی ہوتی۔یعنی آپ اس حالت انتشار کو حالتِ نظم واتحاد سے بدل ڈالنے کی کسی ممکن اور موزوں کوشش سے کبھی نہ تھکتے۔اس لیے آپؐ کے اس طریق کار کا اقتضا یہی ہوگا کہ ملت اسلامیہ جب بھی اختلاف و انتشار سے دو چار ہو، اس کی یہ اہم ترین ذمہ داری ہوگی کہ اپنی اس حالت کو اتحاد و تنظیم کی حالت سے لازماً بدل ڈالے۔

''سنتِ رسولؐ '' کے بعد''سنتِ خلفائے راشدینؓ'' کی طرف آیئے۔چونکہ دَورِ خلافت کا معاملہ دَورِ نبوت کے معاملے سے فطری طور پر مختلف تھا، اور اس میں ملی اختلاف و انتشار کا پیدا ہو جانا عملاً ممکن تھا، چنانچہ ایک حد تک وہ پیدا ہوا بھی، اس لیے خلفائے راشدین کی 'سنت' سے ہمیں اس مسئلے میں براہِ راست رہنمائی مل سکتی ہے۔

سلسلۂ خلافت کی سب سے پہلی کڑی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، اور نہ صرف یہ کہ وہ اس سلسلے کی سب سے پہلی کڑی ہیں، بلکہ آپ ہی کی 'سنت' ہمیں سب سے واضح رہنمائی بھی مہیا کر رہی ہے، اسی لیے اسی کا جائزہ لینا اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مناسب اور مفید رہے گا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب آپ امت کے سربراہ مقرر ہوئے تو عرب کے بعض قبائل، جو حلقہ اسلام میں داخل چلے آرہے تھے، ادائے زکوٰۃ کے معاملے میں حکم عدولی پر اتر آئے، اور انہوں نے حکومت کو مالِ زکوٰۃ حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا۔صورت حال اتنی نازک اور پیچیدہ ہوگئی تھی کہ فاروق اعظمؓ جیسا ''اَشَدُّھُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰہِ '' بھی کوئی سخت قدم اٹھانے کو صحیح نہیں سمجھ رہا تھا۔مگر حضرت صدیق اکبرؓ نے قبائل کے اس رویے کو برداشت کر لینے کے لیے دین میں کوئی گنجائش نہیں پائی، اور پوری عزیمت واستقامت کے ساتھ صاف لفظوں میں اعلان فرما دیا کہ:

''خدا کی قسم! اگر ان لوگوں نے اونٹ باندھنے کی کوئی ایک رسی بھی، جسے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے، میرے حوالے کرنے سے انکار کیا تو میں ان سے اس کے لیے جنگ کروں گا۔'' (مسلم، جلد اول)

اس اعلان کے لفظ لفظ کو اچھی طرح غور سے دیکھیے۔ حضرت صدیق اکبرؓ یہ نہیں فرمارہے ہیں کہ اگر ان لوگوں نے زکوٰۃ نکالنا بند کر دیا تو میں ان سے جنگ کروں گا، بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر ان لوگوں نے اپنی زکوٰۃ کی رقم میرے (یعنی اسلامی حکومت کے) حوالہ کرنے سے انکار کیا تو مَیں ان سے اس کے لیے جنگ کروں گا۔ دوسرے لفظوں میں آپ کے نزدیک بجائے خود یہ بات بھی جنگی اقدام کو ضروری قرار دے دیتی ہے کہ لوگ حکومت کے بیت المال میں اپنی زکوٰۃ داخل کرنے سے انکار کر دیں، چاہے اپنی جگہ زکوٰۃ کے نکالنے اور بطور خود اسے مستحقین پر تقسیم کر دینے میں وہ کسی کوتاہی کو روا نہ رکھتے ہوں۔ ہر شخص محسوس کرے گا کہ یہ واضح طور پر اسلامی نظامِ اجتماعی کا مسئلہ تھا۔ زکوٰۃ روک لینے والوں کا طرزِ عمل اُس نظام میں ایک رخنہ ڈال رہا تھا، اور حضرت ابوبکرؓ کا یہ اعلان جنگ اس نظام کو اسی رخنے سے محفوظ رکھنے کے لیے تھا۔ اس لیے آپ کے اس طرزِ عمل سے آپ کی سنت یہ متعین ہوئی کہ ملی نظام اجتماعی میں پیدا ہونے والے کسی بھی خلل کو برداشت نہیں کیا جاسکتا، اور ہر قیمت پر اس کی روک تھام یا اس کا ازالہ ضروری ہے۔

ایک دوسری روایت میں اسی واقعہ کی یہ مزید تفصیل موجود ہے کہ حضرت عمرؓ نے آپ کو جب یہ مشورہ دیا کہ:

يَا خَلِيْفَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم تَاَلَّفِ النَّاسَ وَارْفُقْ بِهِمْ.

''اے خلیفۂ رسولؐ! ان لوگوں سے ملے جڑے نظر آیئے اور نرمی کا رویہ اختیار کیجیے۔''

تو آپ نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا اس کے الفاظ یہ تھے:

''عمرؓ! زمانۂ جاہلیت میں جہاں تم اتنے سخت تھے وہاں اب اسلام میں اتنے بودے بن رہے ہو! کوئی شک نہیں کہ وحی کا سلسلہ موقوف، اور اللہ کا دین مکمل ہو چکا ہے۔ کیا اب وہ

میرے جیتے جی ناقص ہو رہے گا؟''   (مشکوٰۃ، باب مناقب ابی بکرؓ)

حضرت ابوبکرؓ کے ان لفظوں سے زیر بحث مسئلے میں ایک اور پہلو سے رہنمائی ملتی ہے۔ آپ کے یہ الفاظ اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہیں کہ دین کے مطالبات میں سے اگر کوئی ایک مطالبہ بھی پورا کرنے سے انکار کیا جا رہا ہو تو آپ کے نزدیک یہ دراصل دین، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکمل کیا جا چکا ہے، ناقص ہو کر رہ جاتا ہے، اور مومن و مسلم ہونے کی شان یہ ہرگز نہیں ہے کہ صبر و سکون سے اس صورت حال کو برداشت کر لیا جائے۔ بلکہ ضروری ہے کہ اس دینی مطالبے پر عمل کرنے، عمل کرانے اور دین کامل کو ناقص ہو رہنے کے خطرے سے محفوظ کر لینے کو وقت کا ایک اہم ترین فریضہ بنا لیا جائے۔ گویا دین کو ناقص بنائے جاتے وقت یا اس کے ناقص بنا دیے جانے کی شکل میں خلیفۂ رسولؐ کی 'سنت' یہ ہوئی کہ اسے اس کی اصل حالتِ کمال پر باقی رکھنے یا اس کی طرف واپس لے جانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اب سوچیے، شیرازۂ ملت کا بکھر جانا اور ''وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا'' جیسے بنیادی مطالبۂ دین کا فراموش ہو کر رہ جانا دین کے ناقص ہو رہنے کی بات ہوگی یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے، اور وہ یہ کہ اگر چند قبائل کا حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرنا دین کے ناقص ہو رہنے کے ہم معنیٰ ہے، تو پوری اُمت کا سرے سے بے امام و بے نظام بن جانا، اور بے شمار احکامِ شریعت کا معطل ہو رہنا یقیناً دین کے ناقص ہی نہیں بلکہ ناقص تر اور اپاہج بن جانے کے ہم معنیٰ ہوگا۔ اگر حقیقت یہ ہے تو اس کی موجودگی میں آنجنابؐ کی 'سنت' کی پیروی صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ملت کو پھر سے شیرازہ بند کیا جائے، اور اس کی کھوئی ہوئی منظم زندگی اسے واپس دلا دی جائے۔

ایک دوسرا ارشادِ نبوی ملاحظہ ہو:

اِنَّ الدِّيْنَ بَدَءَ غَرِيْبًا وَّيَرْجِعُ غَرِيْبًا فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ الَّذِيْنَ يُصْلِحُوْنَ مَا اَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِىْ مِنْ سُنَّتِىْ.   (ترمذی جلد دوم۔ صفحہ ۹۲)

''دین کا آغاز 'غربت' کے عالم میں ہوا تھا، اور ایک وقت چل کر وہ پھر اسی عالم میں لوٹ

جائے گا۔ تو مبارک ہو ان 'غربا' کے لیے جو اس وقت میری 'سنت' میں کی اُن چیزوں کو پھر سے درست کریں گے جنھیں لوگوں نے بگاڑ رکھا ہوگا۔''

اس حدیث میں اُمت کی آئندہ بگڑی ہوئی حالت کی خبر دیتے ہوئے جن لوگوں کو خوش بخت اور قابل مبارک باد فرمایا گیا ہے، غور کیجیے وہ کون اور کن صفات کے لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی 'سنت' اور طریقے کے ان اجزا کو پھر سے ٹھیک ٹھاک کریں گے جنھیں غافلوں اور بدعملوں کے ہاتھوں نے بگاڑ رکھا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں آئندہ کی ایک خبر دینے سے زیادہ دراصل ایک وصیت فرمائی ہے اور وہ یہ کہ جب بھی آپ کی 'سنت' کے کسی جز پر آنچ آئے، صاحب احساس مسلمان اس کی حفاظت یا بحالی کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں۔ دنیا میں زندگی بسر کرنے اور اللہ کا بندہ بن کر رہنے کا جو طریقہ آپ چھوڑ گئے ہیں اس کے کسی ایک حصے کو بھی بے پروائی کے ساتھ حوادث زمانہ کی نذر ہو جانے دنیا ایمان کی موت ہے، چاہے قانون (فقہ) کی نگاہ میں اس کی اہمیت چھوٹی سے چھوٹی کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ جہاں تک اللہ کی بندگی اور رسولؐ کی پیروی کا تعلق ہے، آپ کی ہر 'سنت' 'سنت' ہے، اور آپؐ کا قائم کیا ہوا کوئی ایک نقشِ قدم بھی نہیں جسے مومن کی نگاہ مٹایا مٹتا ہوا دیکھ سکے۔

یہاں پھر اسی سوال کو سامنے لائیے، اور سوچیے کہ کیا ملت کے بند بند کا اکھڑ جانا اور اس طرح شریعت کے بے شمار احکام کا معاملات زندگی سے بے تعلق ہو کر رہ جانا دین کا کوئی معمولی فساد، اور سنت وطریقِ رسولؐ کا کوئی چھوٹا موٹا بگاڑ ہے؟ یقیناً نہیں۔ یہ بگاڑ تو اتنا بڑا اور اتنا مہلک ہے کہ اس سے زیادہ بڑے اور مہلک بگاڑ کا دین وسنت رسولؐ کے بارے میں تصور بھی مشکل ہے۔ پھر سب سے بڑے اور مہلک بگاڑ کے سلسلے میں، وصیت نبویؐ کا حق کس طرح ادا کیا جا سکتا ہے؟ یعنی ان لوگوں کے کرنے کا کام کیا ہوگا جو صحیح معنوں میں اسلام کے پیرو ہوں، اور جن کو 'غربا' کا خطاب مل سکتا ہو؟ بلاشبہ اس سوال کا بھی ایک ہی جواب ہوگا، اور وہ یہ کہ ملت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو پھر سے درست کرنے، اور اس کے مطلوبہ نظم اجتماعی کو از سرِ نو قائم کر ڈالنے کی فکر ہر فکر

پر غالب ہو جائے، اور اس کی خاطر ہر وہ جدوجہد کی جائے جو کی جا سکتی ہو۔

قرآن و سنت کے بعد اگر ہم فقہی اور کلامی اصولوں سے بھی دیکھنا چاہیں تو اس بارے میں، جیسا کہ ہونا چاہیے، اس سے مختلف کوئی چیز نہ پائیں گے۔ چنانچہ گزشتہ ابواب میں "نظم مملکت کی دینی ضرورت" کے زیر عنوان ائمۂ اسلام کی یہ تصریحات آپ کے سامنے آ ہی چکی ہیں کہ قیام خلافت کے واجب ہونے پر اُمت کا اجماع ہے، اور اس قیام خلافت کی ضرورت علامہ تفتازانی کے لفظوں میں اس لیے ہے کہ بہت سے واجباتِ شرعیہ کی بجا آوری اسی چیز پر موقوف ہے۔ (لانّ **کثیرا من الواجبات الشرعیة یتوقف علیه**) یہ دونوں حقیقتیں اگر نا قابلِ انکار ہی ہوں گی کہ یہ دونوں ایک تیسری حقیقت کا وجود ضروری ٹھیراتی ہیں، اور وہ یہ کہ اگر امت میں اجتماعیت اور تنظیم باقی نہ رہ گئی ہو تو اس کا فرض ہوگا کہ اسے پھر سے اپنے اندر قائم کرے۔ کیونکہ یہی اجتماعیت اور تنظیم وہ چیز ہے جس پر خلافت و امامت کا قیام موقوف ہے۔ اگر دیواروں کے بغیر چھت نہیں بنائی جا سکتی تو نظم اجتماعی کے بغیر نظم خلافت بھی قائم نہیں کیا جا سکتا۔ مانا ہوا اصول ہے کہ وہ کام بھی فرض بن جاتا ہے جس پر کسی فرض کا ادا ہونا موقوف ہو۔ بہت سے دینی احکام کی بجا آوری ایک امام کے تقرر پر موقوف ہے، اور امام کا تقرر امت کے شیرازہ بند ہونے پر منحصر ہے۔ اس لیے پہلی بات کا ضروری ہونا دوسری کے ضروری ہونے کی دلیل بن گیا، اور جب دوسری ضروری ہوگئی تو اس سے تیسری کا بھی ضروری ہونا آپ سے آپ لازم آ گیا۔

نظم اجتماعی کی بحالی کا طریقہ

یہاں پہنچ کر ہمارے سامنے قدرتی طور پر یہ سوال آ کھڑا ہوتا ہے کہ اس کام کا صحیح طریقہ کیا ہوگا؟ یہ امت، جو ایک بھیڑ کی شکل اختیار کر چکی ہے، پھر 'الجماعۃ' کس طرح بن سکتی ہے؟ اور اسے اس کی کھوئی ہوئی منظم اجتماعیت واپس کیسے مل سکتی ہے؟ یہ سوال بجائے خود تو کافی اہم تھا ہی، مگر موجودہ صورت حال نے اسے اور زیادہ اہم اور ساتھ ہی سخت پیچیدہ بنا دیا ہے۔ کیونکہ یہ سوال

اگر چہ ایسا فطری اور عملی سوال تھا جو سوجھ بوجھ رکھنے والوں کے ذہن میں برابر موجود چلا آ رہا ہے اور اس لیے اس کا جواب بھی برابر سوچا جاتا رہا ہے، لیکن اس سوچ بچار کے سلسلے میں اب تک عام طور پر جو کچھ سنا اور دیکھا گیا ہے وہ سخت ناتسلی بخش ہی نہیں بلکہ بجائے خود اختلاف وانتشار کی ایک افسوس ناک مثال ہے۔ جس کے نتیجے میں مسئلہ بہت کچھ الجھ بھی گیا ہے۔ اس لیے اس پر ہمیں پوری توجہ سے غور کرنا ہوگا۔

اس غور وفکر کی ابتدا کرتے وقت تین بنیادی اور مسلم حقیقتیں ہمارے ذہنوں میں بالکل واضح رہنی چاہییں۔

ایک تو یہ کہ اُمت مسلمہ کو ضرورت، جیسا کہ ''اسلامی اجتماعیت'' کی بحث میں تفصیل سے بتایا جا چکا، کسی مجرد اور بے قید اجتماعیت کی نہیں ہے، بلکہ اس کو ایک مخصوص قسم کی اجتماعیت اور وحدت مطلوب ہے، جس کا شیرازہ صرف 'اللہ کی رسی' ہو اور جس کے وجود کا مقصد شہادت حق، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اقامت دین کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

دوسری یہ کہ جس طرح منظم اجتماعیت کی بحالی ایک دینی ضرورت ہے، اسی طرح اس بحالی کا طریقہ بھی 'دینی' ہی ہونا چاہیے۔ یعنی اس طریقے کا تعین صرف کتابِ الٰہی اور سنتِ رسول کریں گی، نہ کہ زید وبکر کے فلسفے اور نظریے، یا غیر اسلامی تحریکوں کے تجربے اور سنتیں۔

تیسری یہ کہ ہم جس طرح اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی 'سنت' سے کوئی راست اور صریح ہدایت نہیں پا سکے کہ ملی انتشار کی حالت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے، اسی طرح اس بارے میں بھی نہیں پا سکتے کہ جو کچھ کرنا ہے اسے کس طرح کرنا چاہیے؟ اور یہاں بھی وجہ ٹھیک وہی ہے جو وہاں تھی۔ یعنی یہ کہ اس وقت اُمت کی جس حالتِ اختلاف کو سامنے رکھ کر ہم گفتگو کر رہے ہیں وہ اس حالت سے بہت مختلف ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کام کرنا پڑا تھا۔ ہمارے سامنے ایک ایسی مسلمان ملت کی اصطلاح وتنظیم نو کا مسئلہ ہے جو پہلے سے موجود چلی آ رہی ہے جب کہ رسول اللہؐ کے سامنے مسئلہ ایک نئی امت کی تشکیل کا تھا۔ اس لیے نظم اجتماعی کی بحالی کا کام کرنے

کے لیے اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ اور طریق کار میں کوئی ہدایت مل سکتی ہے تو وہ آپؐ کے اسوہ سے اخذ کی ہوئی ہدایت ہی ہو سکتی ہے۔ پھر یہ بات یہیں تک نہیں رہتی، بلکہ اس کے تقاضے اور آگے تک پہنچتے ہیں۔ دونوں حالتوں کے اُس فرق کی وجہ سے، جس کا ذکر ابھی ہوا، اگر زیر بحث حالت کے لیے صریح اور راست رہنمائی اسوۂ نبوی سے نہیں مل سکتی تو خود قرآن مجید سے بھی نہیں مل سکتی۔ اس کی وجہ قرآن حکیم کی وہ مخصوص نوعیت ہے جو اُسے خالص علمی کتابوں سے ممیز کرتی ہے۔ علمی کتابوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع سے تعلق رکھنے والی تمام ممکن باتوں اور حالتوں کو ایک ایک کر کے لیتی ہیں، اور ان کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتی چلی جاتی ہیں۔ ان کو اس بات سے بہت کم بحث ہوتی ہے کہ اس وقت ان کے مخاطب کے عملی مسائل حیات کیا ہیں۔ بلکہ بسا اوقات تو ان کا کوئی متعین مخاطب بھی نہیں ہوتا، اور وہ بالکل تصورات کی دنیا میں اپنے فلسفے بگھار رہی ہوتی ہیں۔ لیکن اللہ کی کتاب انسانیت کا ہاتھ پکڑ کر اسے فلاح کی منزل تک پہنچانے کے لیے آئی تھی، اس کا ایک متعین مخاطب تھا، اور ایک متعین مشن۔ وہ جو کچھ کہتی ضرورت وقت کے تقاضے ہی پر کہتی۔ اس لیے اس نے اُمت مسلمہ کو نظم و اجتماعیت کے ہتھیاروں سے مسلح کرنے کے سلسلے میں ہدایتیں دیتے وقت اگر ایک نئی اُمت کی تشکیل ہی کے مسئلے کو سامنے رکھا، اور پہلے سے موجود کسی پراگندہ مسلمان ملت کو ذہن میں رکھ کر صراحتاً کوئی بات نہیں فرمائی، تو اسے ایسا کرنا ہی چاہیے تھا۔

ان تینوں واضح اور مسلم حقیقتوں کو ذہن میں رکھیے۔ اس کے بعد اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی 'سنت' پر نظر ڈالیے، اور یہ دیکھیے کہ ان کی رُو سے ملت کی نئی تنظیم کا صحیح طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟

قرآن مجید نے امت مسلمہ کی تشکیل کے وقت سے متحد و منظم کرنے کے بارے میں جو بنیادی ہدایتیں دی تھیں، ان کا تعارف پچھلے اوراق میں، ''اسلامی اجتماعیت'' کے زیر عنوان، پوری تفصیل سے گزر چکا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہدایتوں کی تعمیل کس طرح کی تھی۔ یہاں ان ساری چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس اہم سوال پر غور کیجیے کہ

ملت کی تنظیم جدید کے مسئلے میں ان قرآنی ہداتیوں کی اور اس نبوی طریق عمل کی اصولاً کیا حیثیت ہوگی؟ آیا ان ہداتیوں کا اطلاق اس معاملے پر بھی ہوگا یا نہیں؟ اور اگر ہوگا تو کس حد تک؟

اس سوال کو حل کرنے کے لیے ہمیں قرآن مجید کی ان ہداتیوں کے الفاظ اور انداز بیان کا، اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریق عمل کی داخلی نوعیت کا پھر سے جائزہ لینا ہوگا، اور گہری نظر ڈال کر دیکھنا ہوگا کہ ایک خاص صورت حال سے متعلق ہونے کے باوجود ان کے اندر عموم کی شان پائی جاتی ہے یا نہیں؟ یعنی ان کی حیثیت بنیادی طور پر عام اور اصولی ہدایات کی ہے یا حقیقتِ واقعی اس کے برعکس ہے؟ یہ جائزہ ہمیں اس کا جواب واضح طور پر اثبات میں دے گا۔ کیونکہ متعلقہ آیتوں میں ہم اس طرح کا کوئی اشارہ بھی نہیں پاتے جس سے یہ محسوس کیا جاسکے کہ قرآن کی یہ ہدایتیں بنیادی طور پر صرف نبی کے ذریعے سے بننے والی ایک نئی اُمت کی تشکیل و تنظیم ہی سے تعلق رکھتی ہیں، اور اگر اس کے بجائے پہلے سے موجود مسلمان ملت کی اصلاح، تعمیر اور تنظیم کا مسئلہ سامنے ہو تو اس کے لیے کوئی اور طریقہ اپنانا چاہیے۔ اس کے بخلاف ہم صاف دیکھتے ہیں کہ ان آیتوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس میں کی کوئی بات بھی ایسی نہیں جو مسلم اصولی ہدایت کی شان نہ رکھتی ہو۔ حتیٰ کہ ان میں خطاب کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ بھی بالکل عمومی ہے۔ یعنی بات یوں نہیں فرمائی گئی ہے کہ:

اے نبی! اُمت مسلمہ کی تشکیل و تنظیم ان بنیادوں پر کرو، یا اے اصحاب نبیؐ! تمھیں ان خطوط پر اپنے کو سنوارنا اور منظم کرنا چاہیے، بلکہ یوں فرمائی گئی ہے کہ

''اے اہل ایمان! اللہ کا ٹھیک تقویٰ اختیار کرو ——— اور تم سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو۔''

کیا یہ اس حقیقت کا واضح قرینہ نہیں کہ ''اہل ایمان'' کو اپنی تنظیم کا فریضہ ہمیشہ انھی خطوط پر انجام دینا چاہیے، چاہے وہ اس وقت کے ''اہل ایمان'' ہوں جب کہ اُمت کی تشکیل ہو رہی تھی، چاہے بعد کے کسی دور کے ''اہل ایمان'' ہوں جب کہ ملت کے منتشر ہو جانے کے باعث اس کی

تنظیم جدید کی ضرورت در پیش ہوگی۔

عقلی پہلو سے دیکھا جائے تو اس کے نتیجے میں بھی کوئی دوسری بات نہ پائی جائے گی۔ کیونکہ معاملہ چاہے تشکیل اُمت کے وقت کی تنظیم کا ہو، چاہے بعد کی تنظیم کا، یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ مقصد دونوں کا ایک ہی ہے۔ جب مقصد ایک ہی ہے، تو صرف اتنی سی بات ہے کہ ایک کے ارکان باہر سے چھانٹ چھانٹ کر اکٹھے کیے جاتے ہیں اور دوسری کے 'اندر' ہی سے بلائے جاتے ہیں، کام کے طریقوں میں کون سا بنیادی فرق پڑ سکتا ہے؟ ہاں، جہاں تک افراد کے اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی حقوق کا تعلق ہے، اس 'اندر' اور 'باہر' کی بنا پر فرق ضرور واقع ہو جائے گا، اور ایک غیر مسلم کے مقابلے میں ایک بے عمل مسلمان کے حقوق بھی بہر حال کہیں زیادہ ہوں گے، خواہ اس دعوتِ تنظیم کے جواب میں اس کا رویہ معاندانہ ہی کیوں نہ ہو۔ بس یہی ایک فرق ہے جو دونوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ فرق اپنی جگہ بڑا عظیم فرق ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ تنظیم ملت کے بنیادی اصولوں پر وہ کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ اثر انداز ہونا تو الگ رہا، اس فرق کا اس مسئلے سے کوئی تعلق ہی نہیں دکھائی پڑتا۔

غرض جس پہلو سے بھی دیکھیے، ملت کی تنظیم جدید کا طریقہ بھی بنیادی طور پر وہی ہوگا جو اُمت مسلمہ کی تشکیل کے متعلق قرآن حکیم اور اسوۂ رسولؐ میں پایا جاتا ہے، اور وہ ان نکات پر مشتمل ہوگا:

(۱) کام کی ابتدا 'رجوع الی الحق' کی دعوت عام سے کی جائے۔ پوری قوت سے ملت کی خود شناسی کو ابھارا جائے، اسے یاد دلایا جائے کہ وہ اس زمین کی سطح پر کس کام کے لیے موجود ہے، اور جس دین سے اپنی وابستگی کا دعویٰ رکھتی ہے وہ اس کے افراد کو کن صفات سے آراستہ، اور اسے اجتماعی طور پر کس مقدس مہم میں مشغول دیکھنا چاہتا ہے۔ اس 'نفیر عام' کے جواب میں اس کے جو افراد شعور کے ساتھ لبیک کہہ کر آگے بڑھیں، انھیں بتایا جائے کہ تمھارے آقا و مولیٰ کا مطالبہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دو، اور اس کی رضا کے سوا تمھارے سامنے اور کوئی چیز ایسی نہ

رہ جائے جس پر تمھاری نگاہیں ٹک سکیں۔

اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (آل عمران:۱۰۲)

(۲) جو لوگ 'رجوع الی الحق' کی اس دعوت کو فکری طور پر اطمینانِ قلب کے ساتھ قبول کرلیں، اور عملی طور پر اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرنے پر تیار ہو جائیں، انھیں بتایا جائے کہ اپنے جس بھولے ہوئے مقصد کو تم پھر سے اپنا رہے ہو وہ ایک عظیم مقصد اور ایک دشوار مہم ہے۔ تم اسے سر کرنے کے قابل اس وقت تک ہرگز نہیں بن سکتے جب تک کہ تم سب ایک تنظیم، ایک وحدت، اور ایک بنیان مرصوص نہ بن جاؤ۔ اس کے علاوہ تمھارے مومن و مسلم ہونے کا فطری تقاضا بھی یہی ہے۔ اس لیے تمھارا الگ الگ 'متقی' اور 'مسلم' بن جانا ہی کافی نہ ہوگا، بلکہ ضروری ہے کہ تم سب مل کر ایک ایسی منظم جماعت بن جاؤ جو اپنے اجتماعی وجود میں بجائے خود بھی ایک ''مومن، متقی اور مسلم'' وجود ہو۔ اس طرح جو لوگ ایک منظم جماعت کی شکل اختیار کر لینے کے لیے تیار ہوں ——— اور اگر وہ اپنے 'رجوع الی الحق' کے فیصلے میں مخلص ہوں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے لیے تیار نہ ہوں ——— انھیں اس تنظیم کا جزو ترکیبی بنانے والی چیز 'حبل اللہ' (یعنی اللہ کے دین) اور 'دخول فی السلم' (یعنی کامل اطاعت) کے سوا اور کچھ نہ ہونا چاہیے۔ کسی ایسے شخص کو اس تنظیم میں ہرگز نہ لیا جائے جسے کوئی اور رشتہ لاکر جوڑ رہا ہو، جس کا حقیقی محرک اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کے سوا اور کچھ ہو، اور جس کے سامنے صرف امر بالمعروف، شہادت حق، اور اقامت دین ہی کا فریضہ انجام دینا نہ ہو۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ (آل عمران:۱۰۳)

(۳) قائم ہونے والی تنظیم کے دو حقیقی فرائض ہوں گے، جن سے وہ ایک لمحے کے لیے بھی آنکھیں بند نہیں کرسکتی، اور جن پر اس کی کوششیں برابر مرکوز رہیں گی: ایک تو یہ کہ دوسرے افراد ملت کو 'رجوع الی الحق' کی دعوت دے۔ دوسرے یہ کہ افرادِ تنظیم کی تعلیم و تربیت کا اہتمام رکھے۔ ان دونوں باتوں کی ضرورت اور اہمیت بالکل واضح ہے۔ پہلی کا منشا یہ ہے کہ تنظیم کا اکھوا برابر بڑھتا

رہے، یہاں تک کہ وہ تناور درخت بن جائے، اور اُمت کے بکھرے ہوئے اجزا ایک ایک کر کے اس کے نیچے آ جائیں۔ دوسری کی غرض وغایت یہ ہے کہ تنظیم کی اندرونی توانائی برابر قائم رہے، نہ صرف قائم رہے بلکہ بڑھتی رہے۔ اس کے افراد میں ایمان، تقویٰ اور اسلام کی روح مرجھانے نہ پائے، بلکہ پیہم حیات تازہ پاتی رہے۔ ان کے اندر تنظیم سے وابستگی کا حقیقی محرک نہ کبھی کمزور پڑنے پائے، نہ کسی اور محرک سے متاثر ہونے پائے۔

تنظیم نو کی عملی شکل

تنظیم ملت کا طریقہ متعین ہو جانے کے بعد یہ بحث اصولاً تو ختم ہو جاتی ہے، مگر عملاً ختم نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایک مسئلہ اب بھی حل طلب رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ اس تنظیم نو کی عملی شکل کیا ہوگی؟ یہ کام کس طرح انجام پائے گا؟ ایک نبی کی موجودگی میں تو یہ مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ لیکن جب صرف امت ہی امت ہو تو یہ ایک اہم مسئلہ بن جاتا ہے۔ البتہ جہاں تک طریقِ تنظیم کے پہلے اصولی نکتے کا تعلق ہے، اس کی حد تک تو عمل درآمد کا معاملہ بالکل صاف ہے۔ کیونکہ یہ بات ہر وقت متوقع ہے کہ فضا میں فرض کا احساس اُبھر آئے، اور کوئی شخص یا کچھ اشخاص 'رجوع الی الحق' کی منادی کرنے اٹھ کھڑے ہوں، اور توقع کی بھی کیا بات ہے؟ ایسا تو کسی نہ کسی شکل میں آئے دن ہوتا ہی رہتا ہے، لیکن پھر بعد میں کیا ہو؟ کارِ تنظیم کے باقی دونوں اصولی نکتوں پر عمل کیسے ہو؟ آگے قدم کس طرح بڑھے؟ اس ابھرے ہوئے احساسِ فرض کو اور 'رجوع الی الحق' کی اس ابتدائی منادی کو مطلوبہ تنظیم کی آخری منزل تک پہنچا دینے کا پروگرام کیا ہوگا؟ یہ مسئلہ صاف اور بالکل واضح نہیں ہے۔ اس لیے وہ اپنا حل چاہتا ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ اس کا صحیح حل کیا ہوگا؟

ظاہر ہے کہ اس حل کو تلاش کرنے کے لیے بھی ہمیں کسی اور چیز سے نہیں، بلکہ کتاب وسنت ہی سے رہنمائی حاصل کرنا چاہیے۔ یہ رہنمائی ہمیں جن آیتوں اور حدیثوں سے مل سکے گی ان میں سے کئی ایک کتاب کے ابتدائی مباحث میں نقل بھی کی جا چکی ہیں۔ ایک بار ان پر پھر نظر ڈال

لیجیے۔ اس کے بعد سوچیے، جو دین ہر کام کو حتی الوسع باہم مل کر، اور ایک امام یا امیر کی قیادت میں انجام دینا ضروری، یا کم از کم یہ کہ پسندیدہ قرار دیتا ہو، جو نماز جیسی بظاہر مکمل علیحدگی اور تنہائی چاہنے والی عبادت کے لیے باجماعت کا مثالی اہتمام اور ایک امام کی معیاری اقتدا واجب قرار دیتا ہو، جو زکوٰۃ، حج اور روزے کی عبادتوں کو بھی ممکن حد تک اجتماعی شکل ہی میں ادا کرنے کا حکم دیتا ہو، جو اس بات تک کو جائز نہ سمجھتا ہو کہ جنگل میں سفر کرنے والے تین آدمی بھی اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر نہ بنائے ہوئے ہوں ——— کیا ایسا دین اس بات کو پسند کر سکتا ہے کہ تنظیم ملت جیسی عظیم الشان مہم کسی نظم و قیادت کے بغیر انجام دی جائے؟ اور کیا تنظیم کا یہ طریقہ اس کی ان ہدایتوں سے ہم آہنگ اور اس کے مزاج کے مطابق ہوگا؟ عقلِ سلیم اس سوال کا جواب یقیناً نفی ہی میں دے گی۔ بلاشبہ مکی دَور میں ہم 'جماعت' اور 'امیر' 'نظم' اور 'اطاعت' کے الفاظ بولے جاتے نہیں سنتے۔ مگر یہ نگاہ کا دھوکا ہوگا اگر ہم اس سے یہ خیال کرلیں کہ وہاں ان الفاظ کے معانی بھی موجود نہ تھے۔ جس ذاتِ گرامی پر اس کے فدا کار ساتھی اپنی جانیں چھڑکتے تھے، جو اس آسمان کے نیچے ان کی سب سے محبوب متاع تھی، جس کے اشارے بھی ان کے لیے بڑے سے بڑے آمروں اور شہنشاہوں کے فرامین سے بڑھ کر واجب التعمیل اور قابل احترام تھے، وہ کب اس بات کی ضرورت مند تھی کہ ان کے سامنے اپنی قیادت اور امارت کا قانونی لفظوں میں اعلان کرے، اور ان سے اپنی اطاعت کے عہد نامے لکھوائے! چنانچہ اس پورے دَور میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں پایا جا سکتا جو اس بات کا ثبوت ہو کہ وہاں معناً بھی نظم اجتماعی اور نظام اطاعت موجود نہ تھا۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ اہل ایمان کی شان میں ''وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَيْنَهُمْ'' کے الفاظ مکہ ہی میں نازل ہوئے تھے۔ کیا یہ الفاظ ان لوگوں کے حق میں فرمائے جا سکتے تھے جن میں نہ کوئی اجتماعیت ہو نہ کوئی نظم؟ کوئی شک نہیں کہ تاریخی حقائق کی طرح یہ الفاظ قرآنی بھی اس امر کا ثبوت ہیں کہ مکی دور میں نظم و اطاعت کے الفاظ چاہے استعمال نہ کیے گئے ہوں، لیکن وہاں ایک مضبوط نظم ضرور موجود تھا، ایک جان دار اجتماعیت یقیناً کارفرما تھی، دعوت اور امت کے اہم معاملات میں سر جوڑ کر بہرحال بیٹھا

جاتا تھا، غور و بحث کے بعد فیصلے ہوتے تھے، اور ان فیصلوں کے مطابق ہی پورا گروہ مومنین عمل پیرا ہوتا تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اِذن کے بغیر کوئی بات انجام نہ پاتی تھی۔

بہتر ہوگا کہ اس جگہ ایک اصولی حقیقت سمجھ لی جائے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب تک دعوت حق قبول کرنے والے افراد اس طرح کے لوگ ہوتے ہیں جس طرح کے لوگ مکی دور کے اہل ایمان تھے، اور ان کا داعی و راہنما اس طرح کی شخصیت ہوتی ہے جس طرح کی شخصیت ان کے درمیان وہاں موجود تھی، اس وقت تک 'جماعت' اور 'امارت' 'نظم' اور 'اطاعت' کے الفاظ بولے جانے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس وقت ان الفاظ کا بولا جانا اس شخصیت کے مقام عظمت و محبوبیت پر بھی حرف لانا ہے، اور اس کے مخلص پیروؤں کے جذبۂ محبت و تعظیم کی بھی اک گونہ توہین ہے۔ یہ الفاظ تو صرف اس وقت بولے جاسکتے ہیں جب یہ دونوں باتیں، یا ان میں سے کوئی ایک موجود نہ پائی جاتی ہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مکے میں جہاں ''اعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ'' کی تلقین کافی تھی، وہاں مدینے میں ''بِحَبْلِ اللّٰہِ'' کی صراحت ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ''وَلَا تَفَرَّقُوْا'' کی کھلی ہدایت بھی ضروری ہوگئی۔[1]

اسی طرح مکی دَور میں نظم و اطاعت کا ظاہر لفظوں میں کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ مگر مدنی دَور شروع ہوتے ہی ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کے الفاظ استعمال کیے جانے لگے۔ ایسا صرف اس لیے ہوا کہ مدینے میں پہلی بات موجود نہ رہ گئی تھی، یعنی اس وقت کے 'اہل ایمان' بلا استثنا سب کے سب ویسے ہی مخلص، فدا کار اور سراپا اطاعت نہیں رہ گئے تھے جیسے کہ مکی دَور کے تھے۔ بلکہ ان میں ایک خاصی تعداد کچے مسلمانوں کی اور منافقوں کی بھی آگھسی تھی، جن کا ایمانی ضعف یا نفاق انھیں دینی مطالبوں کی خلاف ورزیاں کر جانے پر اکسا دیا کرتا تھا۔ اس لیے اب ناگزیر ہوگیا کہ گروہ مومنین کو ایک متحد گروہ بنے رہنے کا، اور اللہ و رسول اور اولوالامر کی اطاعت کا صریح لفظوں میں بھی حکم دیا جائے۔

---

[1] ''اعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ'' کے الفاظ سورۂ حج کے ہیں جو مکی سورہ ہے، اور ''اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا'' کا ارشادِ الٰہی سورۂ آلِ عمران کا ٹکڑا ہے جو مدنی سورہ ہے۔

یہ تو اس صورت حال کی مثال تھی جب کہ داعی اور رہنما کی شخصیت معیاری اور مثالی قسم کی ہو، مگر اس کے پیرو تمام کے تمام معیاری اور مثالی قسم کے نہ ہوں۔ رہی اس کی اُلٹی صورت حال کی بات، تو اس کی مثالوں سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے۔ جہاں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ جب بھی کچھ مسلمان کسی ضرورت کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور قیادت سے کچھ دنوں کے لیے الگ ہوتے تو ایک امیر کے بغیر اپنے قدم نہ اٹھاتے۔ مدنی دَور میں آئے دن وفود بھیجے جاتے اور مہمیں روانہ کی جاتی تھیں، مگر کوئی وفد یا کوئی دستہ ایسا نہیں ہوتا تھا جس کا ایک امیر نہ ہو۔ مکی دَور میں اگر چہ اس طرح کی صورتیں پیش آنے کے حالات و مواقع نہ ہونے کے برابر تھے، لیکن اگر کبھی ایسی صورت پیش آئی تو اس وقت بھی کوئی دوسرا طریقِ کار اختیار نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ہجرت حبشہ کے موقع پر جب کچھ مسلمان آپؐ کی صحبت سے الگ ہو رہے تھے تو ایسا نہیں ہوا کہ ہر شخص نے اپنے طور پر اپنی راہ لی ہو، بلکہ سب نے ایک جماعت بن کر اور ایک قیادت کے تحت ہجرت کی تھی۔ سب سے پہلا قافلۂ مہاجرین دس آدمیوں پر مشتمل تھا، اور حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو آپؐ نے اس قافلے کا سربراہ مقرر فرمایا تھا۔ (سیرت ابن ہشام جلد اول)

غرض مکی دَور کی ظاہری صورت حال کو دیکھ کر یہ گمان کر بیٹھنا صحیح نہ ہوگا کہ وہاں فی الواقع بھی کوئی اجتماعی نظم کارفرما نہ تھا۔

اس بحث سے ملت کے طریق تنظیم کے بارے میں دین کا تقاضا اور شریعت کا نقطۂ نظر پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور کتاب وسنت کی عام اجتماعیاتی ہدایتیں یہی تلقین کرتی ہیں کہ ملت کی اصلاح و تنظیم جدید کا فریضہ اجتماعی طور پر ایک نظم اور ایک قیادت کے تحت انجام پانا چاہیے۔

شرعی نقطۂ نگاہ کے بعد اگر عقلی اور تجرباتی پہلوؤں سے دیکھیے تو بھی بات یہی نکلے گی۔ تاریخ کے وسیع ذخیرے میں اس بات کی کوئی ایک مثال بھی نہیں پائی جا سکتی کہ دنیا کا کوئی اجتماعی انقلاب کسی اجتماعی اور منظّم سعی و جہد کے بغیر برپا ہوا ہو۔ اس دنیا میں کام کرنے والے قوانین کہتے ہیں

کہ ایسا نہ کبھی ہوا ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے ایک مضبوط اجتماعی نظم کے بغیر اگر تنظیم ملت کی مہم چلائی جائے گی تو وہ بھی کامیاب نہ ہو سکے گی۔ اس سلسلہ میں انفرادی اصلاح و ترتیب کی جو کوششیں انجام دی جائیں گی ان کا حاصل صرف یہ ہو گا کہ مسلمانوں کے اس جنگل میں کچھ مخلص دین دار اور ملّی نظام اجتماعی کی بحالی کے خواہش مند افراد پیدا ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے افراد کی تعداد ''کچھ'' کے بجائے ''بہت'' ہو۔ مگر جب تک اس متفقہ اجتماعی نصب العین کو پا لینے کا جذبہ ان سب کو ایک ہی شیرازے میں مضبوطی سے باندھے ہوئے بھی نہ ہو اور اس غرض کے لیے اجتماعی نظام اور قیادت موجود نہ ہو، ملت اس اجتماعیت سے قیامت تک بہرہ ور نہیں ہو سکتی جو اللہ کے دین کو مطلوب ہے، اور جس کے بغیر، بقول سیدنا عمرؓ، اسلام، اسلام نہیں رہتا۔ ایسے مخلص، دین دار اور ملّی تنظیم کے خواہش مند افراد کے وجود کو، جو بجائے خود اپنی کوئی تنظیم اور قیادت نہ رکھتے ہوں، ملت کی تنظیم نو کی ضمانت سمجھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے پکی اینٹوں کو اوپر تلے رکھ کر یہ سمجھ لیا جائے کہ کسی جنگی قلعے کی دیوار تیار ہو گئی ہے۔ یقیناً یہ بڑی ہی عجیب بات ہو گی کہ مسلمانوں کے اور سارے کام تو منضبط طور پر، ایک نظم اور ایک قیادت کے تحت انجام پائیں، ان کا دین ان سے یہی چاہتا ہو، مگر ٹھیک وہی مہم اس طرح کے نظم و انضباط سے بے بہرہ ہو جو ملت کو ایک مضبوط اجتماعیت اور نظم سے بہرہ ور کرنے ہی کے لیے جاری کی گئی ہو! کیا ایسی صورت میں یہ مہم اپنی مخالف خود آپ ہی نہ ہو گی؟ اور کیا اسی کے ناکام ہو جانے کا یقین دلانے کے لیے خود یہی بات کافی نہ ہو گی کہ نظم و اجتماعیت کی اس متلاشی جدوجہد میں سب کچھ ہے مگر ایک نظم و اجتماعیت ہی نہیں ہے؟

غرض جس پہلو سے بھی دیکھیے، ملی تنظیم کے باقی دونوں اصولی نکات کو بروئے کار لانے کی شکل عملاً یہی قرار پائے گی کہ جو لوگ اس مقصد سے شعوری طور پر وابستہ ہو جائیں وہ ایک جماعتی نظم قائم کر لیں، اور اپنے میں سے ایک ایسے فرد کو اس نظم کا سربراہ منتخب کر لیں جو اس مقصد کی سب سے زیادہ اچھی خدمت انجام دے سکتا ہو۔ پھر ان کا ایک مؤثر شورائی نظام ہو جو 'اَمْرُهُمْ شُوْرٰى

بَیۡنَھُمۡ " کے تقاضوں کا حق ادا کرتا ہو، اور اس طرح پورے نظام وضبط کے ساتھ یہ بھاری اور لمبی مہم مسلسل چلتی رہے۔

یہ حقیقت کسی اظہار و بیان کی محتاج نہیں کہ یہ جماعت بجائے خود 'الجماعۃ' نہ ہوگی، نہ یہ تنظیم، ملی تنظیم کا بدل ہوگی، بلکہ اسے وجود میں لانے کے لیے ہوگی۔ 'سنتِ رسولؐ' اور 'سنتِ خلفائے راشدینؓ' کے ہاتھوں میں اس کی زمامِ کار رہے گی۔ اپنی غربت اور اجنبیت سے وہ پہچانی جائے گی۔ دین حق اور طریقِ رسولؐ کے جس گوشے کو بھی اجاڑا یا بگاڑا جا چکا ہے اس کی تعمیر و اصلاح میں وہ کسی ممکن سعی سے دریغ نہ کرے گی۔

اَلَّذِیۡنَ یُصۡلِحُوۡنَ مَا اَفۡسَدَ النَّاسُ.

گوشہ گیری

گوشہ گیری کی مشروعیت

ایک طرف تو ایمان و اسلام کے لیے منظّم اجتماعی زندگی کا وجود اس حد تک ناگزیر ہے جس کی وضاحت پچھلے صفحات پیش کر رہے ہیں، دوسری طرف قرآن حکیم کے بعض اشارات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض کھلے ہوئے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعیت سے یکسر ناآشنا اور گوشۂ تنہائی کی زندگی بھی غیر اسلامی زندگی نہیں، بلکہ ٹھیک اسلامی زندگی ہے، اور اسے اللہ و رسولؐ کی رضا حاصل ہے۔ مثلاً:

سورۂ کہف کے دوسرے رکوع کو پڑھیے، جہاں 'اصحابِ کہف' کا تذکرہ ہے۔ یہ اصحاب کہف وہ لوگ ہیں جو انسانی بستیوں سے دُور ہٹ کر ایک محفوظ غار میں جا بیٹھے تھے، اور وہیں اپنے اللہ کی یاد میں مشغول ہو رہے تھے۔ یوں کہیے کہ غیر اجتماعی زندگی کی آخری شکل انہوں نے اختیار کر لی تھی۔ قرآن مجید نے ان کی اس سرگزشت کو جس انداز میں بیان کیا ہے اس سے اُن کی اس روش پر کسی ہلکی سی ہلکی ناپسندیدگی کا بھی اظہار نہیں ہوتا۔ اس کے بخلاف اس نے اسے خدا پرستی کے ایک قابل قدر اور اونچے نمونے کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اور ان غارنشینوں کو 'ایمان میں پختہ' اور 'ہدایت میں بلند مرتبہ' قرار دیا ہے:

اِنَّھُمْ فِتْیَۃٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّھِمْ وَزِدْنٰھُمْ ھُدًی۔ (کہف:۱۳)

''بلاشبہ یہ (کچھ) ایسے جوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے، اور جنھیں ہم نے ہدایت کی افزونی عطا فرمائی تھی۔''

اسی طرح یہ حدیثیں دیکھیے:

(۱) قَالَ رَجُلٌ اَیُّ النَّاسِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ مُؤمِنٌ یُجَاھِدُ بِنَفْسِہٖ وَمَالِہٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ ثُمَّ مُؤْمِنٌ مُعْتَزِلٌ فِیْ شِعْبٍ مِّنَ الشِّعَابِ یَعْبُدُ رَبَّہٗ وَیَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّہٖ. (مسلم، باب فضل الجہاد والرباط)

''ایک شخص نے پوچھا: ''اے اللہ کے رسولؐ! سب سے افضل انسان کون سا ہے؟'' فرمایا: ''وہ مسلمان جو اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔'' اس نے کہا: ''پھر کون؟'' ارشاد ہوا ''پھر وہ مسلمان جو کسی گھاٹی میں جا کر گوشہ نشین ہو گیا ہو، وہاں اپنے رب کی عبادت کرتا ہو اور لوگوں کو اپنے شر سے دُور چھوڑے ہوئے ہو۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت میں ''یَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّہٖ'' کے موقع پر ''یَعْتَزِلُ شُرُوْرَ النَّاسِ'' (لوگوں کے شر کو چھوڑے ہوئے اور اس سے دُور رہتا ہو) کے الفاظ ہیں۔ (فتح الباری، جلد ۶، صفحہ ۴)

(۲) یَاْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ خَیْرُ مَالِ الْمُسْلِمِ الْغَنَمُ یَتَّبِعُ بِھَا شَعْفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ یَفِرُّ بِدِیْنِہٖ مِنَ الْفِتَنِ. (بخاری باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء)

''لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جب ایک مسلمان کی سب سے اچھی دولت اس کی بکریاں ہوں گی، جنھیں لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور پانی کی جگہوں میں گھومتا پھرے گا، اپنے دین کو سینے سے لگائے فتنوں سے بھاگتا رہے گا۔''

ان حدیثوں کے آئینے میں صاف دکھائی دیتا ہے کہ اگر مومن جماعتی زندگی سے الگ ہو کر یادِ حق میں مصروف ہو رہے تو یہ کوئی غلط بات نہ ہوگی، بلکہ ایک بہترین رویہ ہوگا جو اس نے اپنایا ہوگا۔

عزیمت نہیں، رخصت

بلاشبہ اس طرح کی باتیں اور ہدایتیں بھی قرآن اور حدیث میں موجود ہیں۔ اور جب ایک چیز قرآن اور حدیث میں موجود ہے تو وہ بھی ٹھیک اسی طرح 'اسلامی' ہی ہے جس طرح کہ کوئی اور

چیز ہوسکتی ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں 'اسلامی' ہونے کا مطلب کیا ہے؟ کیا یہ کہ یہ تنہائی کی زندگی بھی مطلقاً اسلامی زندگی ہے، اور جب بھی اسے اختیار کیا جائے گا ٹھیک اسی طرح معیاری اوراللہ ورسولؐ کی پسندیدہ زندگی قرار پائے گی جس طرح کہ منظّم اجتماعی زندگی قرار پا چکی ہے، یا کچھ اور؟ اس سوال کا صحیح جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں ذیل کی تین اصولی باتوں پرغور کرنا ہوگا:

(۱) ایک منظّم اجتماعی زندگی اختیار کرنے کی جو ہدایتیں مسلمانوں کو دی گئی ہیں ان کی نوعیت کیا ہے؟

(۲) انسان کے پیدا کیے جانے کی غرض و غایت، اور اُمت مسلمہ کا مقصد وجود، یہ دونوں چیزیں گوشہ نشینی کے رویے کو کس نظر سے دیکھتی ہیں؟

(۳) خود قرآن اور حدیث کے وہ ارشادات، جن سے گوشہ نشینی کے رویے کا 'اسلامی' ہونا ثابت ہوتا ہے، اس بارے میں عام اور بے قید ہدایت کی حیثیت رکھتے ہیں، یا حقیقت واقعی اس کے خلاف ہے؟

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، اس سلسلے کی ساری ضروری تفصیلات ہمارے سامنے آ ہی چکی ہیں۔ ان سے حقیقت واقعی قطعاً یہ نہیں معلوم ہوتی کہ جماعتی زندگی بھی اسلام کو مطلوب ہے، بلکہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اصلاً صرف جماعتی زندگی ہی اسے مطلوب ہے۔

وہ صرف یہی نہیں کہتا کہ ''عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ'' (اجتماعی زندگی کو لازم پکڑو)۔

بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ ''اِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ'' (افتراق اور علیحدگی سے پوری طرح دُور رہو)۔

اور یہ کہ اِنَّمَا يَاْكُلُ الذِّئْبُ مِنَ الْغَنَمِ الْقَاصِيَةَ'' (گلے سے دُور اور الگ ہو جانے والی ہی بکری بھیڑیے کا لقمہ بنا کرتی ہے)۔

اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں لیا جاسکتا کہ شریعت نے جماعتی زندگی بسر کرنے کی جو ہدایت دی ہے اس کی تعمیل اختیاری نہیں بلکہ لازمی ہے۔

رہی دوسری بات، تو نہ تو انسان کے پیدا کیے جانے کی غرض و غایت ہی گوشہ گیری کے

رویے سے میل کھاتی ہے، نہ اُمتِ مسلمہ کا مقصد وجود ہی اسے گوارا کرتا ہے۔ انسان کے پیدا کیے جانے کی غرض وغایت قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ کی 'خلافت' اور اس کی 'عبادت' بتائی ہے۔ اگر گوشہ گیری کی زندگی بھی منظم اجتماعی زندگی ہی کی طرح علی الاطلاق اسلامی زندگی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا اختیار کرنا کسی حال میں بھی اور کسی شخص کے لیے بھی غلط نہیں ہوسکتا، ہر مسلمان اسے اختیار کرسکتا ہے، ہر فردِ ملت کو اس کی ترغیب دی جاسکتی ہے، بلکہ یوں کہیے کہ تاکید کی جاسکتی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ کم از کم منطقی طور پر ایک ایسی حالت کا بھی تصور کیا جاسکتا ہے، یا ایسی حالت بھی پسندیدہ اور مطلوب ہوسکتی ہے، جب کہ سارے مسلمان گوشہ میں جا بیٹھے ہوں۔ لیکن یہ صورت حال اگر وجود میں آجائے تو بجائے خود وہ چاہے جتنی بھی پسندیدہ ہو، اتنی بات تو بالکل قطعی ہے کہ اس کی موجودگی میں وہ غایت کبھی پوری نہ ہوسکے گی جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں اس زمین پر اللہ تعالیٰ کی 'خلافت' کا فریضہ ادا ہونے کا کوئی عملی امکان ہی باقی نہ رہ جائے گا، اور اس کی عبادت اور غلامانہ اطاعت اس طرح کہیں بھی انجام نہ دی جاسکے گی جس طرح اسے انجام دیا جانا چاہیے۔ اسی طرح اُمتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود 'امر بالمعروف'، 'شہادتِ حق' اور 'اقامتِ دین' ٹھیرایا گیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اُمت اگر گوشوں میں معتکف ہوجاتی ہے تو وہ کسی وقت بھی اپنے اس فرض سے عہدہ برآ ہوسکے گی! آخر جہاں کوئی معاشرہ ہی نہ ہو وہاں 'امر بالمعروف' کے کتنے مواقع پیش آسکیں گے؟ حق کی شہادت کس طرح دی جاسکے گی؟ اللہ کا دین کہاں اور کن لوگوں پر قائم کیا جاسکے گا؟

اب ان حدیثوں اور قرآنی ارشادات کو لیجیے جن سے گوشہ گیری کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے:

پہلی حدیث میں جہاں کسی گھاٹی میں جاکر گوشہ نشین ہوجانے والے اور اپنے رب کی عبادت کرنے والے کو ایک اُونچے درجے کا مومن بتایا گیا ہے، وہیں اس کے اندر دو باتیں اور بھی موجود ہیں:

ایک تو یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 'راہِ خدا میں اپنی جان و مال سے جہاد کرنے

والے مومن' اور' کسی گھاٹی میں گوشہ نشین ہو جانے والے مومن' دونوں کا ذکر ایک ہی ساتھ نہیں فرمایا ہے، بلکہ پوچھنے والے کے اس سوال پر کہ ''سب سے افضل انسان کون ہے؟'' آپؐ صرف یہ کہہ کر خاموش ہو رہے کہ ''وہ مسلمان جو اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے'' اور جب اس نے دوبارہ پوچھا کہ ''پھر کون؟'' تب اس دوسرے شخص کا تذکرہ فرمایا اور وہ بھی ''پھر'' کے لفظ کی صراحت کے ساتھ۔

دوسری یہ کہ اس گوشہ نشینی کی ایک خاص ضرورت اور اس کا ایک خاص محرک ہونا چاہیے۔ اور وہ یہ کہ انسان' دوسروں کو اپنے شر سے' یا اپنے آپ کو دوسروں کے شر سے بچانا چاہتا ہو۔

یہی حال دوسری حدیث کا بھی ہے۔ اس میں بھی گوشہ گیری کی ترغیب کے ساتھ دو اہم باتیں ارشاد ہوئی ہیں:

ایک تو یہ کہ ''لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے۔'' دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ کوئی غیر معمولی زمانہ ہوگا جس کے کچھ خاص حالات ہوں گے۔

دوسری یہ کہ جب ایسا زمانہ آئے گا تو' خدا ترس لوگ اپنی بکریاں لے کر پہاڑوں اور گھاٹیوں میں اس لیے نکل جائیں گے، یا انھیں اس لیے نکل جانا چاہیے تا کہ ان کا دین فتنوں سے محفوظ رہے۔

اسی طرح اصحابِ کہف کے جس واقعے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ قرآن حکیم گوشۂ تنہائی کی زندگی کو بھی پسندیدہ اسلامی زندگی قرار دیتا ہے، اس کی تفصیل میں یہ امور بھی موجود ہیں:

ایک تو یہ کہ ان حضرات کی تعداد چند سے زیادہ نہیں تھی، جب کہ ان کی پوری قوم مشرک تھی۔

دوسرے یہ کہ قوم کے سامنے انہوں نے اپنے ایمان کا علانیہ اظہار کیا، اسے توحید کی دعوت دی۔

اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. (کہف:۱۴)

نہ صرف دعوت دی، بلکہ اتمامِ حجت کی حد تک دعوت دی اور بحث و مناظرے میں اسے بند کر دیا۔

هٰٓؤُلَاۤءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ. (کہف:۱۵)

تیسرے یہ کہ غار کو انہوں نے اپنی قیام گاہ نہیں بلکہ پناہ گاہ بنایا تھا، اور یہ پناہ بھی انہوں نے اس وقت لی تھی جب ان کی قوم انھیں برداشت کرنے سے انکار کر چکی تھی اور اب انھیں بستی میں ٹکے رہنے کے لیے اپنے ایمان اور اپنی جان میں سے ایک کی بھینٹ دینا ضروری ہو گیا تھا۔

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ. (کہف:۲۰)

قرآن اور حدیث کے ان ارشادات کا یہ جائزہ صاف بتاتا ہے کہ ان سے گوشہ نشینی کا رویہ اختیار کرنے کی جو ہدایت ملتی ہے، وہ عام اور بے قید ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ بعض قیدوں اور شرطوں کے ساتھ مقید ہے۔ کچھ خاص حالات ہیں جن کے اندر ہی اس رویے پر عمل ہوا کرتا ہے۔ ایک دینی ضرورت، یا یوں کہیے کہ ایک بہت بڑی دینی مجبوری ہوتی ہے جس کے تحت مسلمان کو اُدھر جانا پڑتا ہے۔

گوشہ گیری کی زندگی کس نوع کی اسلامی زندگی ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے جن مختلف پہلوؤں سے غور وفکر ہونا چاہیے تھا، ان سب پر ہم ضروری حد تک غور وفکر کر چکے۔ اس کی روشنی میں اس خیال کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ گوشہ نشینی کی زندگی اور جماعتی زندگی، دونوں ہر حیثیت سے یکساں طور پر اسلامی زندگی ہیں۔ اس کے برخلاف حقیقت واقعی یہ قرار پاتی ہے کہ اصل اسلامی زندگی صرف جماعتی زندگی ہے، اور بنیادی طور پر صرف وہی قابل اختیار ہے۔ رہی گوشوں کی زندگی، تو وہ اصل اسلامی زندگی ہرگز نہیں ہے کہ اسے عام حالات میں اختیار کیا جا سکتا ہو۔ بلکہ وہ صرف 'عارضی قسم' کی اسلامی زندگی ہے، جسے بعض خاص حالات میں، اور انتہائی اہم مجبوری کے وقت ہی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یہ 'خاص حالات' فتنہ وشر کے حالات ہیں، اور یہ انتہائی اہم مجبوری، اپنے دین و ایمان کی مجبوری ہے۔ یعنی وہ جماعتی زندگی، جو مسلمان کو دراصل اپنے دینی تقاضے پورے کر سکنے اور اپنے ایمان کی نشو ونما ہی کے لیے مطلوب ہوتی ہے،

جب اپنی اس حیثیت سے بڑی حد تک محروم ہو جاتی ہے، اپنی یہ مطلوبہ افادیت کھو دیتی ہے، اور دین وایمان کے معاملے میں الٹا عمل کرنے لگتی ہے، تو وہ اسے چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور بڑے قلق اور انتہائی حسرت کے ساتھ گوشوں والی زندگی گوارا کر لیتا ہے۔ جہاں انسانی تخلیق کی غرض و غایت، اور اُمتِ مسلمہ کا مقصد وجود پورا کر سکنے کے مواقع ایک قابل لحاظ حد تک بالکل ناپید ہوتے ہیں، اور اللہ کی بندگی صرف ادھوری ہی کی جا سکتی ہے۔

غرض ایمان و اسلام کا اصل وطن تو جماعتی زندگی ہی ہے، اور وہ جیسا چاہیے وہیں پروان چڑھ سکتے اور برگ و بار لا سکتے ہیں۔ لیکن جب ان کا یہ 'وطن' انھیں اطمینان کا سانس نہیں لینے دیتا تو وہ مجبوراً سرزمین غیر میں پناہ گزین ہو جاتے ہیں، اور گوشوں میں جا کر مسافرت کی جیسی تیسی زندگی گزار لے جانے کے سوا ان کے لیے کوئی اور چارہ نہیں رہ جاتا۔

صرف یہی نہیں کہ گوشہ گیری کی زندگی عارضی قسم کی اسلامی زندگی ہے، بلکہ جماعتی زندگی کے مقابلے میں اس کا درجہ بھی 'ثانوی' قسم کا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس زندگی کو مجبوری کی وجہ سے اور دین وایمان کے مفاد ہی میں اختیار کیا جاتا ہے، اور اس میں اپنی کسی کوتاہی کا دخل نہیں ہوتا، مگر اس کے باوجود امرِ واقعی یہی ہے، اور یہ 'مجبوری' اور 'بے قصوری' اس طرزِ زندگی کو اصل اسلامی زندگی کا ہم پایہ نہیں بنا دے سکتی، نہ گوشوں میں بیٹھ کر اللہ کی عبادت کرنے والا اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو اجتماعی زندگی میں رہ کر یہ فرض بجا لاتا ہے۔ اس فرقِ مراتب کی وجہ بالکل کھلی ہوئی ہے۔ پہلے شخص کی عبادت، نماز روزے وغیرہ چند انفرادی اعمال بندگی تک محدود رہتی ہے، جب کہ دوسرے کی عبادت ان انفرادی اعمال سے شروع ہو کر جانی اور مالی جہاد فی سبیل اللہ جیسی آخری حدودِ بندگی تک وسیع ہوتی ہے۔ اس لیے حق یہی ہے کہ پہلے کا مرتبہ دوسرے سے فروتر ہو۔ یہ صرف عقل اور قیاس ہی کا فیصلہ نہیں ہے، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورۂ بالا ارشادات میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے۔

پوچھنے والے نے جب پوچھا کہ سب سے افضل انسان کون ہوتا ہے؟ تو آپؐ نے اس کے جواب میں اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والے مومن، اور کسی گھاٹی میں گوشہ نشین ہو کر اللہ کی عبادت کرنے والے مومن، دونوں کا ساتھ ساتھ تذکرہ نہیں فرمایا، بلکہ صرف پہلی قسم کے مومن کا ذکر کر کے خاموش ہو رہے۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حقیقی معنوں میں ''سب سے افضل انسان'' صرف اسی طرح کے اہل ایمان ہوتے ہیں، کوئی دوسرا مومن ان کا ہم مرتبہ نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ جب دوبارہ پوچھا گیا کہ ''پھر کون؟'' تو ارشاد ہوا کہ:

''پھر وہ مومن جو کسی گھاٹی میں جا کر گوشہ نشین ہو گیا ہو اور وہاں اپنے رب کی عبادت کرتا ہو۔''

یہ پوچھنے والے کا ''پھر'' کا لفظ استعمال کرنا، اور آپؐ کی طرف سے جواب کا بھی اسی لفظ سے شروع ہونا اس حقیقت کو روشن سے روشن تر کر دیتا ہے کہ گوشہ نشینی کا مقام جماعتی زندگی کے مقابلے میں بہرحال فروتر اور ثانوی درجے کا ہے۔ شریعت کی زبان میں اسے یوں کہا جائے گا کہ گوشہ گیری کا راستہ 'رخصت' کا راستہ ہے، عزیمت کا نہیں۔ چنانچہ امام ابوداؤدؒ نے اپنی سنن میں گوشہ گیری سے متعلق حدیث بیان کرنے کے لیے باب ہی ''الرخصة في التبدي في الفتنة'' کے عنوان کا قائم کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس طرز زندگی کے 'اسلامی' ہونے کے باوجود ہم کسی پیغمبر کا اسوہ اس کے حق میں نہیں پاتے۔ ہزاروں انبیا میں سے کوئی نہ تھا جس نے کبھی اس روش کو اپنایا ہو۔ حالانکہ انھیں جس طرح کے سخت حالات سے سابقہ پیش آیا تھا، ہم اس کا ٹھیک ٹھیک تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن چونکہ وہ اللہ کے رسول تھے، اس لیے ان کے لیے ایک ایسی روش کا اختیار کرنا ممکن نہ تھا جسے اختیار کرنے کے بعد وہ انسانی آبادیوں سے علیحدہ ہو رہتے، اور جو عزیمت کی نہیں رخصت کی راہ تھی۔ اور یہ اس لیے کہ انسانی آبادیوں سے علیحدہ ہو جانے کے بعد تو وہ پیغمبری کا فریضہ ہی انجام نہیں دے سکتے تھے، اور رخصت کی راہ اپنانے کی ضرورت انھیں اس لیے نہیں پیش آ سکتی تھی کہ لوگوں کو

اپنے شر سے بچانے' یا اپنے (دین وایمان) کو دوسروں کے شر سے محفوظ رکھنے کا یہاں کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ رہی جان کے خطرے کی بات، تو یہ حضرات اپنی جان کو اپنی سمجھتے ہی کب تھے کہ اسے بچانے کے لیے وقت کے جباروں سے دُور بھاگنے کے ضرورت مند ہوتے۔

حالات وشرائط

اب یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ وہ کون سے مخصوص حالات ہیں جن میں شریعت نے رخصت کی یہ راہ اختیار کرنے کی تلقین فرمائی ہے؟ جہاں تک اس سوال کے اصولی جواب کا تعلق ہے وہ تو اُوپر کی بحث میں واضح طور پر موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ اسلام کی مطلوبہ اجتماعی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو جانے کی ہدایت یا رخصت صرف اس وقت ہے جب معاشرہ 'شر' اور 'فتنہ' کی لپیٹ میں آ گیا ہو، اور صرف اس شخص کو ہے جو اس شر اور فتنے سے اپنے دین وایمان کو بچانے کے لیے ایسا کرنا ضروری سمجھتا ہو۔ چنانچہ دوسری حدیث کے الفاظ:

"یَفِرُّ بِدِیْنِہٖ مِنَ الْفِتَنِ"

صاف اس حقیقت کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ اسی طرح پہلی حدیث کے بارے میں بھی علما نے صراحت کی ہے کہ اس میں "کسی گھاٹی میں جا کر گوشہ نشین ہو جانے" کی جو بات فرمائی گئی ہے اس کا تعلق صرف فتنوں کے زمانے سے ہے۔

وھو مقید بوقوع الفتن. (فتح الباری، جلد۶)

اور خود حدیث کے آخری الفاظ "یَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّہٖ" سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

لیکن اس مجمل اور اصولی جواب سے بات غالباً پوری طرح واضح نہ ہو سکے گی۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس 'فتنے' اور 'شر' کی نوعیت متعین کی جائے جس کا ان حدیثوں میں ذکر ہے، اور معلوم کیا جائے کہ اس سے کس قسم کا فتنہ وشر مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد مطلق فتنہ وشر تو ہو نہیں سکتا، کیونکہ اس معنی کے لحاظ سے تو دنیا کا کوئی زمانہ بھی فتنے اور شر سے خالی نہ تھا۔ حتیٰ کہ خود

دَورِ نبوت اور دَورِ خلفائے راشدین بھی بے فتنہ اور بے شر نہ تھے۔ کیونکہ ان دنوں بھی کم از کم نفاق کے فتنے تو موجود ہی تھے، اور باہمی اختلافات کے خون ریز ہنگامے سر اٹھاتے رہتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ 'فتنہ وشر' جس میں مومن کو اجتماعی زندگی سے اور اس کی ذمہ داریوں سے الگ ہو کر صرف اپنی ہی فکر میں لگ جانے کی رخصت دی گئی ہے، لازماً غیر معمولی قسم کا فتنہ وشر ہے۔ کس حد تک اور کس قسم کا غیر معمولی؟ اس امر کی وضاحت کے لیے مذکورہ احادیث کے ان جملوں پر پھر سے اور گہری نظر ڈالیے:

"یَفِرُّ بِدِیْنِہٖ مِنَ الْفِتَنِ" "یَعْتَزِلُ شُرُوْرُ النَّاسِ" "یَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّہٖ"

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ "شر" اور "فتنے" سے مراد معاشرے کے ایسے سخت ابتر حالات ہیں جن کے اندر مسلمان اپنی ساری حفاظتی تدبیروں کے باوجود اپنے دین وایمان کو محفوظ نہ پاتا ہو، اور شر و باطل کے بڑھتے ہوئے زبردست دباؤ میں ان کا مستقبل اسے تاریک دکھائی دیتا ہو۔ اس حد تک تاریک کہ اب دوسروں کی برائیاں اس کے دل و دماغ پر بھی اثر ڈال دیں گی، اور وہ بھی ماحول کی نجاستوں میں لت پت ہو رہے گا، اور کچھ بعید نہیں کہ کل وہ خود ہی برائی کا پرچارک اور فتنہ وشر کا علم بردار بن جائے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اگر حالات ایسے خراب نہ ہوں، کہ دین وایمان کے حق میں انھیں اتنا خطرناک کہا جا سکے، تو پھر اس رخصت پر عمل کرنا صحیح نہ ہوگا، اور ایسی شکل میں مومن کو اس بات کی اجازت نہ ہوگی کہ جماعتی زندگی سے علیحدہ ہو جائے، ملی نظم واجتماعیت کے مطالبات سے منہ موڑ لے، صرف اپنی ہی ذات سے واسطہ رکھے، اور ملت کو اپنے حال پر چھوڑ دے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی اجتماعی حیثیت بھی کھوتی چلی جائے، اور اس کی راکھ کے اندر خیر و صلاح کی جو چنگاریاں دبی دبائی موجود ہوں وہ بھی روز بروز بجھتی چلی جائیں، اور اس طرح وہ اپنے مقصدِ وجود سے عملاً دور سے دور تر ہوتی چلی جائے۔ ہاں اس رخصت پر عمل اُس وقت ضرور

قابل برداشت ہوسکتا ہے جب ملت میں مطلوبہ نظم اجتماعی بالفعل موجود ہو، اور معاشرے میں خیر غالب ہو۔ ایسی حالت میں اگر کچھ لوگ اپنے مخصوص ذوق کی بنا پر گوشوں میں جا بیٹھیں اور باہر کی دنیا سے بےتعلق ہو رہیں، تو کہا جاسکے گا کہ ملت بحیثیت مجموعی اپنا فرض پورا کر رہی ہے اور اس کی بہت بڑی اکثریت اس کی خدمت اور پاسبانی میں لگی ہوئی ہے، اس لیے کوئی مضائقہ نہیں اگر کچھ لوگ گوشہ نشین ہو گئے ہیں اور اپنی ہی ذات تک اپنی تربیتی اور دینی کوششیں محدود کر بیٹھے ہیں، اگرچہ پھر بھی اتنی بات تو لازماً کہی جائے گی کہ انہوں نے ایک زیادہ اچھے کام کو چھوڑ کر کم اچھے کام پر قناعت کر لی ہے ـــــــ لیکن اگر ملت اس حال میں نہ ہو، اگر وہ اپنا جماعتی نظم کھوتی جارہی ہو، اگر مومن ''الجماعۃ'' سے بھیڑ بنتے جا رہے ہوں، اگر اگر مسلم معاشرے کا اجتماعی رُخ اسلام کے بجائے کسی اور طرف ہو چلا ہو، مختصر یہ کہ صحیح اسلامی نظام اجتماعی اگر کارفرما باقی نہ رہ گیا ہو تو کسی واقعی خطرۂ دین کے بغیر گوشہ گیر ہو جانا اور ملت کی اجتماعی زندگی کو سسکتا چھوڑ دینا ہرگز اسلامی طرز بندگی اور دینی طریق زندگی نہیں۔

عمل کی صورتیں

آخر میں ایک مسئلہ اور وضاحت طلب رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ 'گوشہ گیری' کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اور 'اعتزال' (اجتماعی زندگی سے علیحدگی) کی جس روش کے اختیار کرنے کی رخصت شریعت نے دی ہے، اس کی حدود کیا ہیں؟ اس سوال کے جواب میں کسی ایک ہی صورت کا نام نہیں لیا جاسکتا۔ کیونکہ اس کا انحصار تمام تر حالات پر ہے، جو ہر شخص کے لیے، اور ہر زمانے میں یکساں نہیں ہو سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی شخص کے دین و ایمان کے لیے حالات جس حد تک ناسازگار اور خطرناک ہوں گے، اسی کی مناسبت سے اسے گوشہ نشینی اور اعتزال کی شکل بھی اختیار کرنی ہوگی، مثلاً:

یہ حالات اگر خدانخواستہ، ابتری کی اس حد کو پہنچ گئے ہوں کہ دین کے بنیادی اصولوں پر

بھی قائم رہنا دشوار ہو چکا ہو، اور اس کی بنیادی تعلیمات کا اعلان و اظہار بھی برداشت نہ کیا جاتا ہو تو اس وقت 'گوشہ گیری' کے انتہائی مفہوم اور اس کی آخری شکل کو اختیار کیا جائے گا۔ جس کی مثال اصحابِ کہف کے اُسوہ میں موجود ہے۔ انہوں نے مکمل علیحدگی اور غار نشینی اس وقت اختیار کی تھی جب ان کے لیے اپنی بستی کے اندر کلمۂ حق کہنے کی اجازت باقی نہ رہ گئی تھی، اور انھیں یقین سا ہو گیا تھا کہ اب دعوتِ حق لوگوں کے سامنے ہماری زبانوں سے نکلی کہ ہم پر پتھروں کی بارش شروع ہوئی۔

اور اگر حالات اتنے خطرناک نہ ہوئے ہوں تو اُس وقت گوشہ گیری اور علیحدگی کی جو شکل اپنائی جائے گی، وہ ایسی نہ ہوگی، بلکہ اس سے بہر حال کم تر درجے کی ہوگی۔ یعنی کچھ اس طرح کہ انسان آبادی کو یک قلم تو نہ چھوڑے، مگر عام اجتماعی معاملات سے الگ ہو جائے، فتنے کے علم برداروں کو اپنے حال پر چھوڑ دے، اور ان کی بھڑکائی ہوئی آگ کو بجھانے کے لیے ہاتھ اور زبان کی کوششوں کے بجائے صرف دل سے برا ماننے پر اکتفا کر لے۔ بس اپنی ناگزیر ضروریات زندگی کے لیے کوئی جائز ذریعۂ معاش، جو بہر حال معمولی قسم ہی کا ہو سکتا ہے، اختیار کر لے اور اپنی آخرت کی فکر میں لگ جائے، نماز اور روزے، حج اور زکوٰۃ کا اہتمام رکھے اور عام انسانوں کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں انھیں ادا کرتا رہے۔

جہاں تک عام اندازے کا تعلق ہے، ایک بدتر سے بدتر مسلم معاشرے میں بھی جس خراب صورت حال کا اندیشہ کیا جا سکتا ہے، وہ بس اسی قسم کی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ خود ان حدیثوں میں، جن کے اندر اس 'اعتزال' اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے کی رخصت یا ہدایت دی گئی ہے، نماز کی اقامت اور اللہ کی عبادت کے ساتھ ساتھ ادائے زکوٰۃ کا حکم بھی موجود ہے۔ یہ حکم صاف طور سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے، کیونکہ زکوٰۃ کی ادائی اسی وقت عمل میں آ سکتی ہے جب دوسرے انسانوں سے ربط و تعلق کچھ نہ کچھ باقی ہو۔ غاروں اور گپھاؤں میں تو اس کی کوئی عملی شکل

ممکن ہی نہ رہے گی۔

فیصلے میں احتیاط کی ضرورت

آخر میں اس اہم ترین حقیقت کا یاد دلا دینا بھی ضروری ہے کہ حالات کی نزاکت اور خطرناکی کا درجہ متعین کرنے میں بڑے سخت اور انتہائی بے لاگ جائزے سے کام لینا چاہیے۔ کیونکہ انسانی فطرت کے دو رُجحانات ایسے ہیں جو اس معاملے میں صحیح فیصلے تک پہنچنے میں زبردست روک بن سکتے ہیں اور بنتے رہے ہیں:

ایک تو گوشہ نشینی کا رُجحان۔

دوسرا تن آسانی کا رُجحان۔

اس لیے اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ کوئی شخص ان میں سے کسی رجحان کی بنا پر گوشہ گیری کی طرف بذات خود مائل ہو جائے، اور اپنے اسی ذاتی میلان کے زیر اثر حالات کی خطرناکی کا اندازہ کرنے میں مبالغہ کر بیٹھے، اور انھیں اپنے دین وایمان کے حق میں اتنا خطرناک سمجھ لے جتنا کہ وہ فی الواقع نہ ہوں اور پھر گوشہ نشینی کے بارے میں وارد ہونے والے حدیثوں کو اپنے لیے ایک سہارا بنا کر ملی تنظیم اور جماعتی زندگی سے الگ ہو جائے، یا اگر یہ تنظیم اور اجتماعیت موجود نہ ہو تو اسے از سرِ نو قائم کرنے کی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو آزاد قرار دے لے۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہ فیصلہ دراصل اپنے ذاتی ذوق ورُجحان کی تسکین کے لیے ہوگا، احادیثِ رسولؐ کی پیروی کے لیے نہ ہوگا۔

ایک مومن کی حقیقی پسند اور اس کی آخری کوشش تو اس کے بارے میں یہ ہونی چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو، اجتماعیت سے چمٹا رہے اور اس کی بقا و ترقی یا بحالی میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھے، اور اس سے علیحدگی کی اُسی وقت سوچے جب وہ اس کے دین وایمان کے لیے فی الواقع کھلے ہوئے خطرے کی شکل اختیار کر چکی ہو۔ اور اس وقت بھی اس کی یہ علیحدگی کسی احساس پسندیدگی

کے ساتھ نہ ہونی چاہیے، کیونکہ اسلام نے دین اور دین داری کا جو تصور دیا ہے، اس کی رُو سے یہ فی الواقع کوئی پسند کی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ اجتماعی زندگی کو چھوڑ دینا کچھ بڑھے ہوئے ناخنوں کا تراش پھینکنا نہیں ہے کہ اس سے راحت محسوس کی جائے، بلکہ گوشت کا ناخن سے جدا ہو جانا ہے جس کی اذیت اٹھانے کے لیے کوئی ذی شعور اپنی خوشی سے کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔

❀ ..... ❀ ..... ❀